نظیر اکبرآبادی کی غزلیہ شاعری

علی احمد فاطمی

جب میں اپنی پہلی ملازمت کے سلسلے میں آگرے میں تھا تو اس وقت (۸۳۔۱۹۸۰ء) صوفی، بزرگ شاعر حضرت میکش اکبرآبادی زندہ تھے۔ میں اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ پرانے دور یعنی اکبرآباد کے پرانے شعراء کی خوب خوب باتیں ہوتی تھیں، مجھے بے حد لطف آتا۔ انھیں دنوں میں نے نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر تین چار مضامین لکھے اور میکش صاحب کو سنائے، وہ خوش ہوئے۔ ایک دن کہنے لگے کہ آپ نے بھی ابھی تک نظیر اکبرآبادی کی نظموں پر ہی لکھا ہے۔ ان کی غزلیں بھی خاص ہیں، انھیں بھی پڑھئے اور ان پر کچھ لکھئے۔ پھر انھیں خوش گوار لمحوں میں انھوں نے دیوانِ نظیر کا ایک نایاب نسخہ جسے مرزا فرحت اللہ بیگ نے تلاش کیا تھا اور ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع کروایا تھا وہ بھی اب نایاب ہے، عنایت کیا۔ بہر حال مجھے یاد آرہا ہے کہ انھوں نے تاکیداً کہا تھا کہ ان کی غزلوں کا رنگ دیکھئے گا، بعض اشعار تو میر سے میل کھاتے ہیں۔ جب میں ان خیالات کی روشنی میں دیوانِ نظیر میں شامل فرحت اللہ بیگ کا مقدمہ پڑھ رہا تھا تو مجھے قدرے مایوسی ہوئی، اس لیے کہ بیگ صاحب نے تہذیبِ غزل یا معیارِ غزل کے روایتی سیاق وسباق میں نظیر کی غزلوں میں نقائص زیادہ پیش کئے، خصائص بیحد کم

(اس سے مقدمہ کی اہمیت کم نہیں ہوتی)۔ اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں، اوّل یہ کہ بیگ محقق زیادہ ناقد کم۔ دوئم یہ کہ اردو شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری طبقۂ اشرافیہ کے معیار و مذاق میں ڈوبی ایک خاص تہذیبِ شاعری اور تہذیبِ عاشقی میں غرق رہی۔ اس میں عوامی رنگ نہ کے برابر تھا۔ ہر چند کہ استادِ سخن میر تقی میر کہتے رہے ''پر مجھے گفتگو عوام سے ہے'' لیکن سچ یہ ہے کہ انھوں نے بھی معیار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ زندگی بھر سلیقہ مندی اور معیار بندی کا شکار رہے۔ نظیر کی غزلوں کو سمجھنا ہے تو پہلے نظیر کو سمجھنا ہوگا۔ ان کی ذات صفات، آگرے کے حالات کو بھی سمجھنا ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نظیر اصلاً نظم کے شاعر تھے، وہ بھی عوامی شاعر۔ خواص کو تو وہ خاطر میں ہی نہ لائے۔ چنانچہ خواص نے بھی انھیں تسلیم نہیں کیا۔ احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''نظیر نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی تو عوام نے ہی نظیر کو زندہ رکھا۔ اردو شاعری کی معیار پرستی نے تو نظیر کو ختم ہی کر دیا تھا اگر فقیروں، گداگروں اور معمولی پڑھے لوگوں نے ان کے بنجارہ نامہ، آدمی نامہ اور دوسری نظموں کو یاد نہ رکھا ہوتا۔''
>
> (نظیر اور عوام)

احتشام حسین کے یہ خیالات اور پورا مضمون ان کی نظموں کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔ غزلوں کو نہیں لیکن جب نظم کے سلسلے میں یہ رائے ہے جس میں قدرے پھیلاؤ ہوتا ہے تو غور کیجئے غزلوں کے بارے میں کیا رائے ہوسکتی ہے جس میں کساؤ اس کا لازمی عنصر ہے۔ اختصار و ایجاز اس کا حسن ہے۔ کم و بیش اردو کے بیشتر نقادوں، عالموں کی یہی رائے ہے۔ بعد کے دور خاص طور پر ترقی پسند دور میں جب عوامی شاعری، زمینی شاعری کی کچھ پہچان بنی، گفتگو کا آغاز ہوا تو وہی نظیر نظم کے پہلے بڑے عوامی شاعر کہلائے لیکن غزلیں پھر بھی توجہ سے دور رہیں اور ان پر کم سے کم گفتگو کی گئی۔ اور اگر کبھی کبھار گفتگو ہوتی بھی تو آدھی ادھوری اور طے شدہ ذہن کے ساتھ۔ ترقی پسند نقاد احتشام حسین جنھوں نے نظموں

کے بارے میں غور طلب باتیں کیں وہی ایک مقام پر یہ بھی کہتے ہیں:

''ان کا فن تکمیل کے لحاظ سے بہت ناقص ہے۔ ان کی شاعری تراش خراش کے لحاظ سے بہت نامکمل ہے۔ ان کے اسلوب میں بیحد ناہمواری ہے۔ ان کے تفکر میں گہرائی نام کو نہیں۔ ان کے احساسات اور تجربات میں ایک درمیان کی بھونڈی سادگی اور بھدّی بے ساختگی ہے لیکن پھر بھی نظیر اپنی دنیا کے تنہا مسافر تھے جس نے راہنس کروسے کی طرح سب کچھ خود ہی کیا اور شاعری کے صحیح مصرف کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔''

ان جملوں میں چار الفاظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ''پھر بھی'' ''تنہا مسافر'' ''سب کچھ خود ہی کیا'' ''شاعری کے صحیح مصرف'' دیکھنا یہی ہے کہ بقول مجنوں گورکھپوری:

''نظیر کا حق مارنے کی ہمارے شاعروں اور نقادوں نے بڑی کوشش کی مگر حق کبھی نہ کبھی حقدار کو پہنچ ہی جاتا ہے۔''

حق مارنے اور نظر انداز کرنے کے باوجود ''پھر بھی'' تو یہ پھر بھی کیا ہے۔ وہ اپنے شعری سفر میں ''تنِ تنہا'' کیوں رہے۔ کسی کی کچھ پروا نہ کی ''سب کچھ خود ہی کیا'' اور پھر جو سب سے بلیغ اشارہ احتشام صاحب نے کیا وہ یہ کہ شاعری کا صحیح مصرف کیا ہوتا ہے اور اس حوالے سے نظیر کی شاعری کی اہمیت وافادیت کیا ہے۔ ان عناصر کو لے کر بڑی بحثیں ہو سکتی ہیں اور طویل گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن یہاں مجھے ان غزلوں کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کرنا ہے لیکن مشکل یہی ہے کہ ان کی غزلوں کو ہی سمجھنے کے لیے ان کے ذہن کا نظمیہ مزاج، عوامی مذاق اور ان کی شخصیت کا شوخ پن بلکہ کھلنڈرا پن، چنچل پن (نظیر نے اپنی غزلوں میں لفظ چنچل کا کثرت سے استعمال کیا ہے) کو سمجھنا ہوگا۔

نظیر اتالیق تھے۔ مزاج میں کھلنڈرا پن اور قلندری تھی۔ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں نیم اور بیر کے دو درخت تھے۔ انھیں کے درمیان وہ پاس پڑوس کے بچوں کو

پڑھاتے تھے، جن میں ہندو مسلم سبھی تھے۔ تخت پر بیٹھے، تہبند پہنے درس و تدریس بھی کرتے اور شاعری بھی۔ عزیز احمد نے لکھا ہے:

''نیم اور بیری کے درختوں کے درمیان نظیر نے جو زاویہ سنبھالا وہ عوام ہی کے لیے تھا۔ ان کی غزل ایسی غزل ہے جس کے عوام طلب گار تھے۔''

(نظیر کی غزل گوئی)

ایک جملہ یہ بھی:

''غزل کو انھوں نے خالصوں سے لیا اور عوام کے قابل بنا دیا۔''

ایسا نہیں تھا کہ نظیر فارسی شاعری کی روایات سے واقف نہیں تھے۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے پیش رو اردو شعراء میر، سودا، درد وغیرہ سے متاثر نہیں تھے۔ اکثر غزلوں میں اشعار کی مماثلتیں گواہی دیتی ہیں لیکن اصل میں وہ ایکدم اوریجنل شخص و شاعر تھے۔ تقلید، صناعی یا بیجا قسم کی صنعت گری ان کی فطرت میں ہی نہ تھی۔ نظیر کی فطرت وہاں جاگتی ہے جہاں وہ آزادانہ طور پر اپنی انفرادی دلکشی اور والہانہ سپردگی کو پیش کرتے ہیں۔ دو شعر دیکھئے۔

نیچی نگہ کی ہم نے تو اس نے منھ کو چھپانا چھوڑ دیا
کچھ جو ہوئی پھر اونچی تو رُخ سے پردہ اُٹھانا چھوڑ دیا

ہیں اگرچہ یاں تو اور بھی محبوب خوب خوب
لیکن اسی کو کہتے ہیں سب خوب خوب خوب

ان اشعار اور ان جیسے اشعار کو پڑھئے تو احساس ہوتا ہے کہ آسان سی گفتگو ہو رہی ہے۔ محبوب کا سادہ سا تعارف ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نظیر دقیق و عمیق زبان میں غزل نہیں کہتے۔ اس رنگ کی بھی غزلیں ہیں جن میں اساتذہ کا رنگ جھلکتا نظر آئے گا۔ ایسے اشعار میں نظیر کی استادی اور زبان دانی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے لیکن یہاں بھی وہ جس طرح کی سجاوٹ

اور لگاوٹ کو شامل کر کے شعر کو سجاتے ہیں اس سے نہ صرف ان کی مہارت ظاہر ہوتی ہے بلکہ وہ عوامی مشاہدہ بھی جھلکتا ہے جس کے لیے نظیر دور دور تک جانے جاتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے۔

بدن میں جامۂ زرکش، سراپا جس پہ زیب آور
کڑے بُندے چھڑے چھلّے انگوٹھی نو رتن ہیکل

اس شعر میں پہلا مصرعہ روایتی ہوسکتا ہے لیکن دوسرے مصرعہ میں کڑے، بندے، چھڑے، چھلّے وغیرہ کو جس طرح مصرعہ میں نگینے کی طرح سجایا ہے وہ ان کی قوتِ مشاہدہ کا پتہ دیتا ہے نیز خلّاقانہ طریقۂ کار کا بھی۔ محبوب کی آرائش و زیبائش میں غزل میں اس طرح کے الفاظ استعمال کم ہو پائیں یا شاید نہیں ہو پائیں۔ محبوب کے چہرے پردے سے لے کر سجاوٹ، لگاوٹ، زیور، لباس، مہندی، مسّی وغیرہ کے جتنے نمونے اور جلوے نظیر کے یہاں ملتے ہیں اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ فراق گورکھپوری نظیر کی اسی غیر معمولی خوبی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نظیر کی شعری دنیا ایک کبھی نہ ختم ہونے والی اکھنڈ راس لیلا ہے جس میں برابر ابیر گلال، رنگ ترنگ، تھاپ جھنکار دکھائی اور سنائی دیتی ہے۔ ایسی سدا بہار اور سدا سہاگ شاعری دنیا کے ادب میں بہت زیادہ نہیں ملتی۔''
(نظیر بانی)

نظیر کا ایک شعر اور ہے۔

ملے روٹھے ہنسے روئے پھرے بیٹھے ڈرے سنبھلے
نظیر اک دل لگا کر واہ کیا کیا کچھ کیا ہم نے

کوئی سخت گیر نقاد اس لب ولہجہ کو غیر معیاری ہی کہے گا۔ میں بھی معیاری ثابت نہیں کروں

گا۔لیکن اس حقیقت سے کس طرح منھ موڑ لوں کہ ایک عام قاری کے لیے یہ شعر اس لیے اہم ہے کہ اس میں زندگی کے بیشتر جذبات، رویّے، نقل و حرکت سب سمٹ آئے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں نظیر نے جو روانی بھر دی ہے اس کی وجہ سے وہ مصرعہ خود اپنے آپ میں مکمل شعر ہو گیا ہے۔ایسے اشعار سے نظیر کی غزلیں بھری ہوئی ہیں اور یہ شاعری عام قاری کے لیے ہے خاص ناقد کے لیے نہیں اور نظیر کے ذہن میں عوام ہی ہیں، خواص نہیں۔ نقاد تو بالکل نہیں۔ چند اشعار اور ملاحظہ کیجئے۔

صنم کے لب میں پان، ہاتھوں میں مہندی، پیرہن رنگیں
کناری ہے، دھنک ہے، ہار ہے کیا کیا بہاریں ہیں

کفوں میں انگلیوں میں لعل لب ہیں چشم مے گوں میں
حنا آفت، ستم خندق، مسی جادو، فسوں کاجل

اب دیکھیں پھر اے ہمدم کس روز منھ اس کا دیکھیں گے
وہ زلف وہ تِل وہ خال و خط وہ رنگ و نقشا دیکھیں گے

وہ کاجل چنچل آنکھوں کا وہ مہندی نازک ہاتھوں کی
وہ پان وہ لب حسن وہ چھب وہ گوش وہ بالا دیکھیں گے

چھب ڈھب کے کتنے انیک روپ ہیں، انھیں صرف الفاظ کی بازی گری تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ انسانی زندگی کی جو وسعتیں ہیں اور جو حرکتیں ہیں انھیں عامی تشبیہات اور مشاہدات سے سجا کر پیش کرنے کا جو ملکہ اور حوصلہ نظیر کو حاصل تھا وہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔لیکن نظیر کی غزلیں صرف یہیں تک نہیں ہیں بلکہ عام سجاوٹ اور

لگاوٹ کے پیچھے ایسے ایسے خوبصورت اور معیار اشعار ہیں جو میر، سودا سے میل کھاتے ہیں، جن پر توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی گفتگو کی گئی۔ مثلاً

چمن میں جب سے لب اس غنچہ لب نے کھولے ہیں
گلوں کے پہلو میں غنچے نہیں پھپھولے ہیں

کھلے بالوں سے منھ کی روشنی پھوٹے نکلتی ہے
تمھارا حسن تو صاحب اندھیرے کا اجالا ہے

وہ مکھڑا گل سا اور اس پر جو نارنجی دو شالہ ہے
رخِ خورشید نے گویا شفق سے سر نکالا ہے

بندھا ہے جب سے خیال اس کا عجب طرح کی لگن لگی ہے
کبھی وہ دل میں، کبھی وہ جی میں، کبھی وہ چشمِ پُر آب میں ہے

وہی اِدھر ہے، وہی اُدھر ہے، وہی زباں پر، وہی نظر میں
جو جاگتا ہوں تو دھیان میں جو گیا ہوں تو خواب میں ہے

آئینہ رُخوں کی محفل میں جس وقت عیاں تم ہوتے ہو
سب آئینہ ساں رہ جاتے ہیں حیران تمھاری صورت کے

طرفہ فسوں سرشت ہے چشمِ کرشمہ ساز میں
لیتی ہے اک نگاہ میں جبر بھی قرار بھی

ہوئی شکل اپنی یہ ہم نشیں جو صنم کو ہم سے حجاب ہے
کبھی اشک ہے، کبھی آہ ہے، کبھی رنج ہے کبھی تاب ہے

گل کی رونق جو ہے بلبل ہی کے منڈلانے سے
شمع کی گرمیٔ بازار ہے پروانے سے

خیالِ یار سدا چشمِ نم کے ساتھ رہا
مرا جو چاہ میں دم تھا وہ دم کے ساتھ رہا

جو میخانے میں جاکر ایک جامِ مئے پیا ہم نے
تو جس جا خشت پائے خم تھی واں سر رکھ دیا ہم نے

دل جب بندھا ہمارا اس زلف کی رسن سے
کس کس طرح کی بندش دیکھی شکن شکن سے

اس طرح کے سجے سجائے بامعنی عشقیہ اشعار اردو کی معقول ومناسب شاعری کی صف میں بہ آسانی کھڑے کئے جاسکتے ہیں۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں شوخی وطرّاری کی جو روایت رہی ہے نظیر کی غزلیں اس کی غمّازی تو کرتی ہی ہیں نظیر کا اپنا عشق، اظہارِ عشق یا زاویۂ عشق جس طرح جھلکتا ہے، یہ روایت اگرچہ فارسی سے آئی ہے تاہم اردو میں بھی ولی سے لے کر حسرت، فراق تک پھیلی ہوئی ہے۔ عشق کے جتنے متنوع اور مختلف رنگ اردو شاعری میں پھیلے ہوئے ہیں بقول خلیل الرحمٰن اعظمی کہ:

''اردو میں عشق اتنے بھیس بدل کر آتا ہے کہ ہم کس کے بارے
میں کہیں کہ فلاں کا عشق صحیح ہے اور فلاں کا غلط۔ اس کی الگ الگ
پہچان بھی ممکن نہیں۔''

لیکن اس بھیڑ میں نظیر کا عشق صرف اس لیے پہچانا جا سکتا ہے کہ وہ بھی عام سا انسان ہے اور عام طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے چھب ڈھب، چھل بل بھی عامی جیسے ہیں۔

اب میں نظیر کے متصوفانہ رنگ کے کچھ شعر پیش کرتا ہوں۔ جہاں ایک نئے نظیر سے ملاقات ہوتی ہے۔

کیا کاسۂ مئے لیجئے اس بزم میں اے ہم نشیں
دورِ فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں

چراغِ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ
یہ بزم تم کو مبارک ہو ہم تو چلتے ہیں
کیا کیا کہیں دنیا میں ہم انسان یا حیوان تھے
خاک تھے کیا تھے غرض اک آن کے مہمان تھے

کہتے ہیں جس کو زندگی دم کی ہوا ہے اے نظیر
ہم کو تو آج کُھل گیا عقدہ یہ اک حباب سے

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب

بے جا رہِ عشق میں اے دل گلۂ پا

یہ اور ہی منزل ہے نہیں مرحلۂ پا

حباب آسا تری ہے زندگی اس بحرِ دنیا میں
اگر تو غور سے دیکھے تو یہ مہلت غنیمت ہے

مشیّن کفن تھا معطّر بدن تھا
نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

اورایک غزل کے چار اشعار۔

رات دن فرحت و عشرت میں بسر کرتے تھے
کبھی گلشن میں پھرے اور کبھی مئے نوش ہوئے
ایکدم چرخِ حسد پیشہ سے مانندِ چراغ
دیر پل بھر نہ لگی آہ جو خاموش ہوئے
اب کوئی نام و نشاں سے نہیں ان کے آگاہ
ایسے وہ خاطرِ عالم سے فراموش ہوئے
جب سنا میں نے یہ اس شخص سے احوالِ نظیر
روح تھرّا گئی لرزاں خرد و ہوش ہوئے

ان اشعار کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ ان میں تصوف کا ہلکا سا رنگ ہے۔ اسے گہری صوفیانہ شاعری کے زُمرے میں شامل کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اکبرآباد کے ہی ل احمد اکبرآبادی نے نظیر کی غزلوں پر ایک نہیں دو طویل مضامین لکھے ہیں۔ ''نظیر کا مسلکِ حیات'' میں وہ صاف طور پر کہتے ہیں:

''نظیر کو ایک صوفی شاعر ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری کسی مخصوص طبقہ کے لیے نہیں بلکہ خاص و عام، شہر و دہقانی سے کے لیے تھی۔''

ل احمد کے قلم سے ایک جملہ اور نکلتا ہے:

''نظیر مجرد روحانیت کے قائل نہ تھے۔''

ایسا اس لیے تھا کہ وہ عوام کے درمیان، عوام کے لیے وقف تھے۔ انھوں نے تصوف کو ہی عام کیا اور اسے آسمان سے اتار کر زمین بنا دیا۔ عوامی بنا دیا۔ نظیر کی ذاتی زندگی کے حالات کا زیادہ علم نہیں ہوتا۔ عبدالغفور شہباز نے محنت سے کچھ حقائق جمع کیے ہیں، خود نظیر نے پوری ایک غزل اپنی شخصیت کے بارے میں لکھی ہے جس میں درویشانہ تصویر زیادہ اُبھرتی ہے اور مسلک و مبلغ ظاہر ہوتا ہے۔

کچھ یہ بھی تھا کہ جب نظیر نے آنکھیں کھولیں تو برج کے علاقہ میں بھکتی شاعری کے چرچے تھے اور اردو میں بھی دہلوی صوفیانہ شاعری پروان چڑھ چلی تھی، ان کا بھی کچھ اثر ضرور رہا ہوگا۔ اس سے یہ تو لگتا ہے کہ ان کے یہاں قناعت جگہ پا لیتی ہے لیکن ساتھ ہی زندگی جینے کا جذبہ بھی اُبھرتا ہے۔ ان کے یہاں عدم و وجود کے تصورات بھی ملتے ہیں لیکن عدم سے زیادہ وجود کا یقین ملتا ہے۔ وہ عالمِ پیری میں بھی محبت کی رنگا رنگی اور مشربی سے الگ نہیں ہوتے۔ وہ اتالیق تھے۔ عوام کے بیچ رہتے تھے۔ کوچہ و بازار میں پھرتے تھے۔ زندگی میں ہماہمی، جوش اور جذبہ تھا اسی لیے ان کے تصوف میں بیگانگی اور تنہائی دور دور تک نہیں ملتی۔ بقول ل احمد:

''وہ کوچہ و بازار میں بھی پھرتے تھے اور میلوں ٹھیلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ رنگ بھنگ میں بھی تھے اور وعظ و پند میں بھی۔''

لیکن پھر بھی نظیر سے درد جیسی گہرائی اور میر جیسی دردمندی کی امید لگانا مناسب نہیں۔ اس لیے کہ نظیر نہ صوفی تھے نہ فلسفی۔ بس اتالیق تھے۔ طبیعت کے غنی تھے۔ نہ کوئی آستانہ تھا اور نہ کوئی تکیہ۔ تکیہ تھا تو بس خدا کا۔ ایک معمولی گھر تھا اور ہندو مسلم طلباء۔ انسانی رابطے اور عرو میلے ٹھیلے۔ نظیر کا یہی رابطہ اور راستہ انھیں صرف مخصوص عوامی لہجہ دیتا ہے بلکہ کہیں کہیں تو تشبیہ و استعاروں میں بھی مقامیت اور ہندوستانیت ڈال دیتا ہے۔ زمین، فطرت اور

مناظرِ فطرت کے مقامی رنگ اور مثال دے کر ایسے ایسے شوشے چھوڑتا ہے جو کم از کم نظیر سے قبل کسی اردو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ دو تین اشعار اس نوعیت کے دیکھئے:

اس سیاہ ابر میں یوں اُڑتے ہیں بگلے جیسے
لبِ مالیدۂ ہستی میں درِ دنداں کی صفا

جگنو اس طرح چمکتے ہیں جوں وقت سنگار
ماتھے پر ہاتھی کے شنگرف ہی گویا جھڑکا

مور کا شور فغاں غوک کی جھینگر کی پکار
پی پی ہر آن پپیہے کے ہے کوئل کی صدا

نظر آتی ہے تری مانگ میں یوں سلکِ گہر
ابر میں بگلوں کی جس طرح قطار آئے نظر

کن انکھیوں کی نگہ گپتی اشارت قہر چتون کی
جو ودوں دیکھا تو برچھی ہے جو یوں دیکھا تو بھالا ہے

ملاحظہ کیجئے غزل کے دورِ زرّیں میں جب حرف ولفظ کی استادانہ دسترس صرف مزاجِ سخن ہی نہیں معیارِ سخن بنی ہوئی تھی، جہاں خیال بندی سے زیادہ الفاظ کی بندش، قادر الکلامی کی پہچان بنی ہوئی تھی۔ جہاں غیر معیاری، غیر لطیف، غیر فصیح زبان کا استعمال ایک طرح سے ممنوع قرار دے دیا گیا ہو۔ وہاں نظیر ان تمام معیار و مذاق سے بے خبر و بے نیاز اپنی غزلوں میں معشوق کے چمکتے ہوئے دانتوں کی مثال بگلے کی قطار سے دے کر ایک نئی بظاہر آسمانی لیکن بباطن زمینی ہوا باندھ رہا ہو۔ یہی نہیں دیگر اشعار میں تو وہ جگنو، مور، کوئل کو

لاتے ہیں اور حد تو یہ کہ پیہہ اور جھینگر تک لے آتے ہیں، وہ بھی غزل کے نرم و نازک دائرے میں۔ جب اس طرح کی بظاہر غیر ادبی، غیر تخلیقی اور غیر معیاری کوششیں بعد کے ترقی یافتہ دور میں ممکن نہ ہوسکیں لیکن نظیر اس دورِ زرّیں میں نیم اور بیری کے درختوں کے درمیان بیٹھے اپنے آزاد ذہن سے اپنی اختراع کردہ ہندوستانی تشبیہات کو پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے کسی قسم کا خوف و تعلق کا احساس نہیں کرتے۔ یہ کس قدر انحرافی قدم تھا۔ فراق جیسے غزل گو نے کہہ دیا:

''جیسے ہوا آزاد ہے اسے روکا نہیں جا سکتا ویسے ہی نظیر بھی کہیں بند نہیں ہے۔''

کہا جا سکتا ہے کہ اردو غزل کو ایرانی تشبیہات و استعارات سے آگے لے جا کر ہندوستانی تشبیہات سے مزیّن کرنے اور چرند پرند، زیور لباس، مہندی مسّی، بندہ چھلاّ وغیرہ سے آراستہ کرنے میں نظیر کو اولیت حاصل ہے تو شاید غلط نہ ہو۔ یہی نہیں وہ زبان و بیان میں بھی روزمرّہ کے الفاظ اور ترکیبات کا جا بجا استعمال کرتے ہیں۔ ایسے ایسے عامی الفاظ استعمال کرتے ہیں جس کا اُس دور میں کیا بعد کے دور میں بھی استعمال کرنے میں ہزار تکلف رہا ہے۔ اس رنگ کے بھی دو تین شعر دیکھئے۔

کیا کیا لگاوٹ بے بدل کیا کیا رکھاوٹ بر محل
کیا کیا بناوٹ پل بہ پل کرتی تھی وہ زہرہ جبیں

یہ مہر و ماہ جو نشیب و فراز ہیں گرداں
تمھارے باغ میں ایسے کئی ہنڈولے ہیں

ہمارے قطرۂ اشک اس کی سرد مہری سے
کسی زمانے میں موتی تھے اب تو اولے ہیں

وہ گورا پنڈا اور اس میں سرخی مگر خدا نے لے سر سے پا تک
کیا ہے میدا تو موتیوں کے اور اس کو گوندھا شہاب میں ہے

اب ذرا یہ دو محاوراتی انداز کے شعر بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔

ہم ایک نظر دیکھ نظیر اس کو جو بھاگے
بولا کہ اسے لیجیو ہاں جانے نے پاوے

یہ ستم دیکھ ذرا منھ سے کلتے ہی نظیر
اس نے اس سے اس نے اس سے اس نے اس سے کہہ دیا

ملاحظہ کیجئے لگاوٹ، رکھاوٹ، ہنڈولے اور اولے۔ اسی طرح ایک غزل میں ردیف تھی بکھیڑا ہے، تڑیڑا ہے یا جھمکے کی لٹک، مکھڑے کی دمک وغیرہ نظیر آزادنہ استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی استاد، نقاد اس پر جو بھی اعتراض کرے، ناک بھوں چڑھائے، بازاری کہے لیکن نظیر ان سب سے بے پروا اپنی دُھن میں شاعری کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا نہ تھا کہ نظیر طویل بحر میں مسجّع اور مقفّیٰ زبان استعمال کرنے میں قدرت نہ رکھتے تھے۔ بعض طویل بحروں کی ایسی غزلیں ہیں جن میں ان کی استادی اور قادرالکلامی جھلکتی ہے۔ چند اشعار اس مزاج کے بھی دیکھئے۔

اب دیکھیں پھر ہم اے ہمدم کس روز منھ اس کا دیکھیں گے
وہ زلف وہ تِل وہ خال وہ خط وہ رنگ وہ نقشا دیکھیں گے
وہ کاجل چنچل آنکھوں کا وہ مہندی نازک ہاتھوں کی
وہ پان وہ لب وہ حُسن وہ چھب وہ گوش وہ بالا دیکھیں گے

الفاظ کا ذکر آ گیا ہے تو یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ نظیر کی کثرت نویسی اور کثرتِ لفظی کے بارے میں جہاں ایک طرف تعریفاً یہ خیال ہے کہ نظیر سے زیادہ کسی اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتے،

انیس اور جوش کے یہاں بھی نہیں۔ نظیر بانی میں فراق گورکھپوری پورے اعتماد سے لکھتے ہیں:

''موضوع کی توسیع اور بیان میں انیک پہلوؤں اور حصوں کو شاعری میں اُبھارنے کا جہاں تک تعلق ہے انیس، حالی، اکبر، اقبال کوئی بھی نظیر کی گرد تک نہیں پہنچتا۔ اگر نظیر کے قریب کوئی پہنچتا ہے تو جوش ملیح آبادی۔ اردو کے کسی شاعر کو مجموعی حیثیت سے نظیر سے بڑا ماننے یا بڑا بتانے کی ہمت سنجیدہ نقاد نہیں کرسکتا۔''

بعد کے دور کے ترقی پسند نقاد شارب ردولوی نظیر سے متعلق اپنے ایک مضمون کا آغاز ہی ان جملوں سے کرتے ہیں:

''نظیر اپنے عہد کے ایک روایت شکن شاعر تھے۔ انھوں نے زبان کی روایت سے بھی بغاوت کی اور موضوع اور اظہار کے سلسلہ میں بھی اپنا راستہ الگ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں ان کی زبان بھی اعتراض کا سبب بنی اور ان کے شعری رویّے سے بھی شکایت رہی۔''

نظیر کی زبان اور حرف ولفظ پر اعتراض اگر ان کے عہد تک محدود رہتی تو بات اور تھی لیکن یہ اعتراض تو ہمارے دور تک پہنچتی ہے۔ جدید اور محترم نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے چند جملے ملاحظہ کیجئے:

''ان کے یہاں الفاظ کی کثرت ہے تنوع نہیں۔''

''ان کے یہاں الفاظ نئی نئی شکلیں نہیں اختیار کرتے، نئے نئے معنی نہیں اوڑھتے۔''

''الفاظ کی فراوانی متوجہ تو کرتی ہے لیکن بڑا شاعر نہیں بناتی۔''

''نظیر الفاظ کی صرف فہرست تیار کرتے ہیں۔ اس فہرست میں بس
الفاظ ناگزیر نہیں ہوتے اور بعض تو صرف زورِ بیان کے لیے
بڑھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔''

(نظیر اکبرآبادی کی کائنات)

ایک اور جدید نقاد شمیم حنفی کا یہ خیال بھی ملاحظہ کیجیے:

''نظیر کے الفاظ، ان کے الفاظ میں گھری ہوئی رنگا رنگ دنیا اور اس
دنیا کے ہر دیار اور دائرے سے گذرتا ہوا ہر لفظ کے روزن سے
جھانکتا ہوا آدمی اتنا عام، مانوس اور معمولی دکھائی دیتا ہے کہ اس کے
بارے میں سوچ بچار کی ضرورت بڑی مشکل سے سر اُٹھاتی ہے۔
انھوں نے جو کچھ دیکھا برتا اور محسوس کیا اسے جوں کا توں ایک
جانے بوجھے لسانی خاکے میں سمو دیا اور یہ سب کچھ اس طمانیت،
سکون اور سادگی کے ساتھ انجام دیا کہ ایک لمحے کے لیے بھی، کیا
جذب وفکر اور کیا زبان و بیان کسی کے ہاتھوں کسی کے ہاتھوں
پریشان نہ ہوئے جو جیسا کچھ جی میں آیا ہے بے جھجک کہہ دیا اور اپنی
سادہ کاری پر پریشان نہ ہوئے۔''

(میاں نظیر)

غزلیہ شاعری میں حرف ولفظ کا برتاؤ اور اس برتاؤ میں کساؤ اختصار وایجاز یقیناً اہمیت رکھتا ہے لیکن اس برتاؤ میں پیچ دار گھماؤ بھی ہو معنی کی تہہ داری ہو یا نہ ہو لیکن حرف و لفظ کی بازی گری و پیچیدگی ضرور ہو۔ لیکن یہ عمل قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ زندگی کی طرح شاعری میں بھی رنگا رنگی ہوتی ہے۔ صرف میر و غالب تو شاعر نہیں۔ خسرو، کبیر اور نظیر بھی شاعر ہیں۔ سب کے رنگ جدا ہیں، مضمون جدا ہیں۔

دراصل نظیر کی شاعری کا زمانہ، غزل کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے۔ جہاں خیال

بندی، معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ زبان کی معیار بندی اور حرف ولفظ کی درستگی وغیرہ کا بڑا دخل تھا۔ دہلی اور لکھنؤ سے الگ اکبرآباد کے گوشے میں بیٹھے نظیر کی آزاد طبیعت کو یہ تمام قسم کی بندشیں کیوں کر موافق آتیں۔ جب انھوں نے متعدد بلاووں کے باوجود تاج گنج اور آگرے سے باہر جانا منظور نہ کیا تو باہر کی باتوں، پابندیوں وغیرہ کو وہ کس طرح قبول کرتے۔ وہ فطرت پسند اور آزاد طبیعت کے شخص و شاعر تھے۔ انھوں نے کچھ انحراف، کچھ طبیعت کے میلان کے تحت مقامی اور عوامی الفاظ و اصطلاح کا خوب خوب استعمال کیا لیکن ان کا یہ آزادنہ عمل نظموں میں زیادہ ہے، غزلوں میں کم کم۔ لیکن کثرت نویسی کی وجہ سے جو تکرار اور الفاظ کی بھرمار ملتی ہے اس سے بہت غلط فہمیاں تو پیدا ہوتی ہیں لیکن ایسا نہ تھا کہ وہ سب کے سب غیر معیاری تھے یا وہ زبان کے تخلیقی استعمال سے واقف نہ تھے۔ یہ بات تسلیم کہ غزل کساؤ کا فن ہے اور نظیر کے یہاں پھیلاؤ زیادہ ہے لیکن اس پھیلاؤ کا تعلق مقدار سے زیادہ ہے، معیار سے کم۔ ان کے مصرعوں کو ملاحظہ کیجئے۔ ایسے کسے ہوئے مصرعے، چُست بندشیں اور پُر لطف آہنگ ملے گا کہ غزل گوئی کا ایک نیا لطف اور سماعت رنگ و آہنگ میں ڈوب جاتی ہے۔ ان کے قطعات، ترجیع بند، ترکیب بند وغیرہ ملاحظہ کیجئے۔ کہیں کہیں میر اور سودا کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں لیکن ہم نے کچھ مفروضات قائم کر لیے ہیں۔ ہمارا ذہن تحفظات میں قید ہے۔ ہم نے اپنے ذہن کو عادی (Typed) بنا دیا ہے۔ ہم ہر شاعر کو میر و غالب اور ہر شاعری کو شوخ عشقیہ شاعری، استادانہ شاعری، قادرالکلامی کہیں رمزیت تو کہیں مجہولیت کے حوالے سے پڑھنے اور سننے کے عادی ہو گئے تھے (اور کم و بیش آج بھی ہیں) اس لیے نظیر کی شاعری کا معمولی پن، کُھلا پن، سادگی، فطرت پسندی وغیرہ ہمیں راس نہ آئی اور عرصۂ دراز تک نہ آئی اس لیے نظیر سے ہم بے نیاز رہے۔ بے خبر رہے۔ داغ کے چونچلے، مومن کے معمّے وغیرہ ہمیں زیادہ پسند آئے۔ بعد کے دور میں نظیر کی کچھ پہچان ضرور ہوئی لیکن وہ بھی ان کی نظموں کے ذریعہ زیادہ، غزلوں کی طرف توجہ بلکہ انصاف ہم آج بھی نہیں کر پائے ہیں۔ شاید اس لیے کہ نظیر

کی غزلیں مروّجہ اسلوب، روایتی اظہار اور فرسودہ تعیش پسندانہ ذہنیت سے انکار و انحراف کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کا شعری رویّہ آزادانہ تھا۔ مستانہ تھا اور کہیں کہیں عامیانہ بھی۔ اگر میر کا اثر دکھائی دیتا ہے تو حیرت کی بات نہیں۔ کہیں کہیں تو استادِ سخن کا لہجہ بھی مستانہ اور عامیانہ ہے لیکن ہم انھیں آزاد کر دیتے ہیں اور نظیر کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، نظیر نے اپنا ایک الگ دبستان قائم کیا۔ بعد کے بعض شعراء نے نظیر کا چربہ اختیار کیا۔ عزیز احمد ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''غزل کی گلیاں اور شاہراہیں کچھ اس قسم کی ہیں کہ ان میں زمانِی مسلسل کی ایسی زیادہ اہمیت نہیں۔ آتش کے بعد کے شعراء کی بعض خصوصیات بھی نظیر کے بعض بعض شعروں میں جھلک دکھا جاتی ہیں۔ مثلاً شیفتہ کا ثقہ پن۔

چُپ کے چُپ کے ہی لے لیا دل کو
نگہ شرمگیں نے کام کیا

یا صفدر مرزا پوری کا انتہائی پُرتصنع پُرتکلف لکھنوی انداز

کان میں اس کے نہیں لعل و گُہر دونوں طرف
چھد رہے ہیں کا ن و دریا کے جگر دونوں طرف

اور کہیں کہیں تو بالکل جدید غزل کی سی الفاظ و تخیل کی روایتی ہے اور نظیر کے اشعار پر حسرت موہانی کے کلام کو دھوکہ ہوتا ہے۔

ہر مژہ کو تیر سے ہے ہمسری چشم کو افسوں گری سے ارتباط
قد کو ہے سروِ سہی سے ہم قدی تن کو ہے نازک تری سے ارتباط

جن شعراء کے کلام سے مشابہت یہاں ظاہر کی گئی ہے وہ تقریباً
سب کے سب نظیر کے بعد کے ہیں۔اس لیے یہاں سوال کسی طرح
کے اثر کا نہیں بلکہ رجحان اور سمت کا ہے۔روایتی رجحان اور سمت کا
استعمال نظیر کے یہاں اس کو بدلنے کے لیے ہے۔یہ روایتی رجحان
اور سمت نظیر میں بڑی انفرادی دلکشی کے ساتھ موجود ہے۔''
(نظیر کی غزل گوئی)

عظیم شاعری کی ایک پہچان یہ ضرور بتائی گئی ہے کہ جس کی تقلید نہ ہو سکے، جیسے غالب۔لیکن ایک مفید، عمدہ اور بامعنی شاعری کی قسم ایسی بھی ہوتی ہے جسے اپنے عہد میں پہچان تو نہیں ملتی لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا ہے بندشیں اپنے آپ ٹوٹتی ہیں۔سختیاں دور ہوتی ہیں۔دامن وسیع تر ہوتا ہے۔پھر اکثر کُھلے ذہن اور روایت شکن شاعری کی پہچان از خود ہونے لگتی ہے اور وہ خواص وعوام دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہوتی ہے۔نظیر تو کُھلے طور پر عوامی تھے لیکن اثر تو اس عہد کی خاص شاعری سے ہی لیا، غزلوں میں بطورِ خاص۔ان کا سراپا، ان کی تشبیہات، ان کی سادگی و پُرکاری تھی تو روایتی اور مروّجہ نظیر نے اپنی سادہ مخصوص تخلیقی پیش کش سے اسے ایک الگ رنگ دے دیا۔ان کے عوامی زاویہ نظر نے اس میں ڈھیر سارے عناصر، موضوعات کا تنوع، الفاظ کی کثرت یہ سب کہ سب نظیر کی اپنی دین ہے۔سراپا کے تعلق سے ممتاز ناقد عزیز احمد کے یہ خیالات ملاحظہ کیجئے:

''نظیر نے سراپا کو بھی غیر روایتی اور انفرادی رنگ میں رنگا ہے۔سراپا
کی لہلہاہٹ ان کی اپنی نظموں کی ہے۔

صنم کے لب میں پان، ہاتھوں میں مہندی، پیرہن رنگیں
کناری ہے، دھنک ہے، ہار ہے، کیا کیا بہاریں ہیں

یہ سب چیزیں لکھنؤ کی شاعری میں الگ الگ تو مل جائیں گی لیکن ایک ہی جگہ جمع شاید ہی

ملیں اور 'بہاریں' تو نظیر کی ہی ہوسکتی ہیں۔ کہیں الفاظ کی بہتات، ان کی فہرست، روانی، شیرینی اور ترنم سے سراپا کھینچا ہے۔

اب دیکھیں پھر اے ہمدم کس روز منھ اس کا دیکھیں گے
وہ زُلف، وہ تِل، وہ خال، وہ خط، وہ رنگ وہ نقشا دیکھیں گے

وہ کاجل چنچل آنکھوں کا، وہ مہندی نازک ہاتھوں کی
وہ پان، وہ لب، وہ حسن، وہ چھب وہ گوش وہ بالا دیکھیں گے

زبان کی سجاوٹ، حرف و لفظ کی بناوٹ، محبوب کی لَٹ اور اس کے سراپا کی رکھاوٹ نظیر کے علاوہ اور کہاں۔ ایسا لگتا ہے کہ محبوب بند کمرے سے نکل کر کسی باغ، چمن میں سیر کر رہا ہے جہاں کُھلی ہوا ہے، پھول پتوں کی مہک ہے اور کہیں کہیں کانٹوں کی چُبھن بھی۔ نظیر کے اس کُھلے پن اور غالباً پہلی بار محبوب کو مؤنث استعمال کرنے کی غیر معیاری، بازاری کہا گیا۔ کچھ باتیں اس میں درست ہوسکتی ہیں لیکن ایک اہم نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ابدالی اور درّانی کے پے در پے حملوں نے دلّی کو جس قدر برباد اور خانہ خراب کر دیا تھا جس کی وجہ سے بڑے بڑے شعراء کو دہلی چھوڑنا پڑا۔ کوئی رام پور چلا گیا۔ اکثر نے لکھنؤ کی راہ پکڑی اور لکھنؤ اس وقت سب سے محفوظ جگہ تھی اس لیے میر، سودا، جرأت، مصحفی سبھی لکھنؤ چلے گئے۔ اس لیے کہ لکھنؤ زبان وتہذیب کے حوالے سے دہلی کے بعد دوسری بڑی آماجگاہ تھا۔ لیکن نظیر دہلی سے آگرہ آئے وہ بھی کم عمری میں۔ آگرہ لکھنؤ ہر گز نہ تھا۔ اسی طرح نظیر بھی میر وسودا نہ تھے۔ انھیں کسی راجہ یا نواب کی سرپرستی نہیں ملی۔ معمولی سے محلّہ میں ایک معمولی سے مکان میں رہنے لگے اور زندگی گذارنے کے لیے بچوں کو اپنے گھر کے آنگن میں بڑھانے لگے۔ اس طرح جانے انجانے میں اردو شاعری کا ایسا مدرسہ کُھل گیا جو خالص عوامی تھا۔ زمین اور زندگی سے جُڑا ہوا۔ جہاں رومان کم تھا،

حقیقت زیادہ تھی۔ جہاں دربار نہیں تھا، بازار ہی بازار تھا۔ شارب ردولوی کے یہ جملے بیحد معنی خیز اور فکر انگیز ہیں:

''اس طرح پہلی بار اردو زبان و ادب کا رشتہ اس کی سرپرستی کے قدیم اداروں، امراء و روساء کے درباروں سے ٹوٹ کر ایک نئے ادارے سے وابستہ ہوا جو عوامی ادارہ تھا۔ نظیر اکبرآبادی کے اس (Contribution) کی طرف توجہ نہیں دی گئی کہ ایک زبان جو مدنی زبان سمجھی جاتی تھی اور اپنے فارسی کے رشتے پر ناز کرتی تھی، اسے نظیر نے اس کی اپنی زمین اور عام انسانی مسائل اور ثقافت سے جوڑ دیا۔''

(نظیر کی زبان اور اس کے تہذیبی رشتے)

نظیر کی شاعری اور لسانی ثقافت سے متعلق اس بڑی حقیقت پر غور کرنے کے بجائے اسے بازاری کہہ کر اس سے منھ موڑ لیا گیا جب کہ نظیر ایک دو نہیں آٹھ زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ صرف فارسی زبان نہیں، کلام پر اچھی نظر رکھتے تھے۔ ان کی ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جن میں غیر معمولی صنعت کاری، زیبائش و آرائش ملتی ہے۔ جس کے کچھ نمونے دیے جا چکے ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار اور ملاحظہ کیجئے۔

اس سرخ لب سے ہم نے لعل یمن کو دیکھا
جب ہنس دیا تو سلکِ درّ عدن کو دیکھا
تارِ نگہ ہمارا ہے آج تک بھی رنگیں
کل ہم نے ایک ایسے گل پیرہن کو دیکھا
سنبل ہوئی تصدق، دیکھ اس صنم کے کاکل
نسریں نثار لائی جب اس کے تن کو دیکھا
بلبل نے ہو کے نازاں کل یوں کہا جو ہم سے

میں نے تو گل کو تم نے اس گل بدن کو دیکھا
ہم نے نظیر ہنس کر جب اس کو یہ سنایا
تو نے چمن کو، ہم نے رشکِ چمن کو دیکھا

ان اشعار کو دیکھئے اور ان جیسے بعض اور اشعار کو بھی ملاحظہ کیجئے ان میں معنوی اعتبار سے کیا ہے۔ فکر و خیال کی کتنی گہرائی ہے۔ اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہی ہے کہ شاعری میں صنّاعی و کاریگری کی بس ایک حد تک اہمیت ہے۔ شعر بڑا ہوتا ہے جذبات و احساسات کے برملا اور نرم و نازک اظہار سے، تفکر و تعمق سے اور افکار و اقدار کے خلّاقانہ اظہار سے۔ اور یہ بھی کہ شاعری صرف ذات کا اظہار نہیں ہوتی بلکہ اس اظہار میں در پردہ کائنات بھی سموئی رہتی ہے۔ اپنے عہد کی آواز بھی ہوتی ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اپنے عہد کا درپن بھی ہوتی ہے اور شاعر کا مخصوص ذہن اور وژن بھی۔

تسلیم کہ غزل جیسی صنف میں ذات، باطن، داخلیت وغیرہ کا دخل کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں اس ضمن میں ہمارے پاس بیحد قیمتی سرمایہ ہے۔ نظیر کے یہاں بھی کہیں کہیں ذات کے عکس نظر آتے ہیں۔ ایک پوری غزل میں ہی انھوں نے اپنی ذات کا تعارف کرایا ہے۔ اظہارِ عشق، رنج و غم، وصل و فراق وغیرہ میں بھی ان کی ذات دکھائی دیتی ہے لیکن ان کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے زیادہ کائنات کو دیکھتے ہیں۔ چمن کو دیکھتے ہیں۔ بازار کو دیکھتے ہیں۔ زمانے کی ہوا، جوانی کی وفا پھر اس کا انجام بھی دیکھتے ہیں کہتے ہیں۔

کہا یہ دل نے مجھے ایک دن کہ باغ کو دیکھ
ذرا تو چل کے گلستاں کو شب چراغ کو دیکھ
جوں ہی گیا میں چمن میں تو دل ہوا خرّم
گلوں کے حسن کو اور ناز اور دماغ کو دیکھ
کہ اس میں آیا نظر مجھ کو اک گلِ لالہ

میں شاد اس کے ہوا عیش با فراغ کو دیکھ
یکا یک اس نے کہا تو نگہ نہ کر مجھ پر
نہ میرے بادۂ شبنم سے پُر ایاغ کو دیکھ
نہ مری دیکھ تو سبزی نہ رنگ سرخ نظیر
ہے دردمند اگر تو تو میرے داغ کو دیکھ

کچھ اور اشعار دیکھئے۔

حباب آسا تری ہے زندگی اس بحر دنیا میں
اگر تو غور سے دیکھے تو یہ مہلت غنیمت ہے

تو جس کو زیست سمجھتا ہے وہ ہے شعلۂ حُسن
تو جس کو عیش ہے گنتا سو وہ ہے نقش بر آب
تو آب جس کو سمجھتا ہے عطشِ غفلت سے
وہ موجِ آب نہیں ہے فقط ہے موجِ سراب

باتوں باتوں میں وہ محبوب سے بھی کہنے میں تکلف نہیں کرتے۔

ہو کے محبوب دل آرام دل آزار نہ ہو
گل کیا ہے تجھے اللہ نے تو خار نہ ہو

بے سبب ہو کے خفا رنگ نہ بدلا کیجئے
چشمۂ صاف محبت کو نہ گدلا کیجئے

حُسن کو مت دیر پا اپنے سمجھ غافل نہ ہو
یہ وہ طائر ہے جسے اُڑتے نہیں لگتی درنگ

ایسے حکیمانہ متصوفانہ اور فنکارانہ اشعار سے بھری پڑی ہے نظیر کی غزلیہ شاعری، جس کے ڈانڈے بہ آسانی میر، سودا، درد وغیرہ کی شاعری سے ملائے جاسکتے ہیں۔ لیکن شاید ان پر اس لیے توجہ نہیں دی گئی ہے کہ یہ کالے اور گدلے ہیں۔ اور شاید یہ بھی کہ یہ نہ دہلی کے ہیں اور نہ لکھنؤ کے۔ اکبرآباد کوئی اسکول ہو یا نہ ہو لیکن نظیر اکبرآبادی اپنے آپ میں ایک اسکول، ایک دبستان ضرور تھے کہ ان کی غزلوں میں تہذیب و ثقافت، تصوف و حکمت، جلال و جمال، زبان و بیان کے ایسے ایسے نمونے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ بے ساختگی، سادگی اور پاکیزگی کے ایسے ایسے جلوے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ اتنے انداز و اسلوب، اتنی وسعتیں، اتنی جہتیں، حرف و لفظ کی کثرت اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی اس کا اعتراف تو سبھی کرتے ہیں۔ بقول فراق:

''اس کی مثال انیس اور اقبال کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ یہی نظیر کا وصف ہے، جسے عیب سمجھا گیا۔''

بہر حال ایک عجیب ناسمجھی، بے قدری کی روایت قائم ہوتی گئی سب کہ سب کل بھی اور آج بھی نظیر کو بے زبان شاعر سمجھتے رہے۔ جب کہ اس نے غزل جیسی کسی ہوئی صنف، بخیل صنف کو مالا مال کیا اور قلّتِ لفظی والی صنف کو کثرتِ لفظی سے سیراب کر دیا۔ حُسن و جمال کے روایتی موضوع کو ایک نیا اور حقیقی جمال عطا کیا۔ یہاں تک کہ نئی نئی مقامی اور زمینی تشبیہات سے آراستہ کیا، جس سے اردو غزل اس عہد میں محروم تھی۔ دو شعر دیکھئے۔

یوں تو ہم تھے یوں ہی کچھ مثل انار و مہتاب
جب ہمیں آگ دکھائی تو تماشا نکلا

کس طرح سنبل ہو ان زلفوں سے آکر سر بہ سر
یہ لٹک، یہ بل، یہ پیچ و تاب یہ خوشبو کہاں

کوئی بتائے کہ اردو غزل میں انار و مہتاب، لٹک اور بل، کوئل اور پپیہا، بگلہ اور مور، جامن

اور ہر سنگار وغیرہ کہاں تھے جو تھے وہ سب کہ سب مستعار، فارسی سے اُدھار، جہاں ہندوستان کم ایران زیادہ بولتا نظر آتا ہے۔لیکن نظیر پہلے غزل کے شاعر ہیں جہاں زمینی، ہندوستانی تشبیہات کا برملا اور خلاّقانہ استعمال ہوا ہے۔وہ بھی اس لیے کہ ان کا تعلق زندگی سے تھا، زمین سے تھا، عوام سے تھا۔ان کا تعلق اگر نہیں تھا تو دربار سے، امراء و روساء سے، اعلیٰ طبقہ سے، مال و دولت سے، لعل و گہر اور بڑے گھر سے۔معمولی اتالیق، معمولی گھر، معمولی رہن سہن اور معمولی انسان لیکن سراپا انسان ہی انسان۔غور کیجئے اگر اردو شاعری میں نظیر کی طرح دس بیس شاعر اور ہوتے تو آج کبیر، جائسی، رحیم، رسکھان وغیرہ سب ہمارے بھی ہوتے۔نظیر پر ہی مضمون لکھتے ہوئے احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اردو کی اس معیار پرستی سے جہاں کچھ فائدے ہوئے ہیں، اچھے خاصے نقصانات بھی ہوئے ہیں۔ہم نے تو نظیر کو بھی کھو دیا ہوتا اگر نیاز نے نظیر نمبر نہ شائع کیا ہوتا اور ترقی پسند نقادوں نے ادب اور زندگی اور ادب اور عوام سے رشتے جوڑے تو نظیر پر بھی مضامین لکھے، جن کے عنوان ہی ملاحظے کیجئے۔''نظیر اور عوام'' از آل احمد سرور۔''نظیر اکبر آبادی اور عوام'' از احتشام حسین۔''نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں واقعیت اور جمہوریت'' از مجنوں گورکھپوری۔ یہ مضامین فکر و منطق کے اعتبار سے اتنے جامع تھے کہ بعض جدید نقاد بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔ جیسے ''ماضی کا پورا آدمی'' از محمود ہاشمی۔اردو شاعری کے انسان'' از سلیم احمد۔''میاں نظیر'' از شمیم حنفی۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے شاعروں کو خاطر میں نہ لانے والے نقاد کلیم الدین احمد نے بھی نظیر کو اردو شاعری کا درخشاں ستارہ کہا۔اکیلے شمس الرحمٰن فاروقی یہ کہتے رہے:

''میں نظیر کو بڑا شاعر نہیں سمجھتا۔اچھا شاعر بھی نہیں سمجھتا۔اچھی یا بڑی شاعری ان کے دائرے سے باہر ہے۔''

فاروقی صاحب بزرگ و محترم نقاد ہیں، اس لیے انھیں کے ہم عصر نقاد شمیم حنفی کے یہ جملے پیش کرتا ہوں جو ایک طرح سے فاروقی کا جواب ہیں:

''جدید نقادوں میں بھی کچھ لوگ نظیر کو بڑا شاعر تو دور شاعر بھی نہیں مانتے۔ نظیر کی شاعری سے بھی ان کا مطالبہ کم وبیش وہی ہوتا ہے جو غالب، اقبال اور راشد سے ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اب بھی تفکر، تجربے اور مشاہدے کی ایک حد سے آگے جانا نہیں چاہتے اور ہر واردات کا جواز اپنی مرکزی روایت میں ڈھونڈتے ہیں۔ کتنی عجیب اور پریشان کرنے والی بات ہے۔''

ان نقادوں اور ان کے گراں قدر مقالوں نے ایک طرح سے نظیر کو از سرِ نو دریافت کیا لیکن ان میں سے بیشتر مقالات کا تعلق نظیر کی نظموں سے ہے، غزلوں سے نہیں یا بہت کم۔ نظیر کی غزلوں پر میری دانست میں سب سے اچھا مضمون ل احمد اکبر آبادی نے لکھا ہے۔ اس کے بعد عزیز احمد اور ابواللیث صدیقی نے لیکن نے ل احمد کا مضمون نظیر کی غزلوں کے ساتھ بڑی حد تک انصاف کرتا ہے۔ لیکن ہماری مشکل یہ کہ ہم نے خود ل احمد کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ شعر وادب کی دنیا میں انصاف کس طرح ہوتا ہے اور کون کرتا ہے، یہ بھی ایک معمہ ہے۔ اس لیے اس کو وقت پر چھوڑ دینا چاہئے۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ ۱۸۳۰ء میں نظیر کے انتقال کے ایک سو دس سال بعد ۱۹۴۰ء میں نیاز فتحپوری رسالہ ''نگار'' کے نظیر نمبر کے ذریعہ اسے ایک نئی زندگی اور نئی پہچان دے دیں گے۔ اس نمبر اور نیاز کا یہ تاریخی کارنامہ تو ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے غلط نہ ہوگا اگر یہاں خود نیاز فتحپوری کی رائے بھی پیش کر دی جائے:

''نظیر نے ہر رنگ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا اور صحبت ومجلس میں شریک ہو کر اس نے خود ان تمام باتوں کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو نظیر کے علاوہ ہندوستان کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

''اس میں شک نہیں کہ نظیر اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کا عجیب وغریب شاعر تھا، جس میں کبیر کے اخلاق اور خسرو کی ذہانت کا نہایت دلکش امتزاج پایا جاتا تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں تغزل سے ہٹ کر سب سے پہلے اسی نے نظمیں لکھنے کی ابتدا کی اور سچ پوچھئے تو انتہا بھی کر دی، لیکن افسوس ہے کہ وہ بہت قبل از وقت پیدا ہوا۔ وہ اِس زمانے کا شاعر تھا، اسی زمانے میں اسے ہونا چاہئے تھا۔''

(نظیر میری نظر میں)

چلتے چلتے ایک بات اورل احمد اکبرآبادی سے لے کر فراق گورکھپوری تک نے اکثر کہا ہے کہ نظیر بے استادے تھے۔ اگر کسی استاد کا اثر تھا تو وہ میر تقی میر کا تھا۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ میر نظیر سے ذرا ہی سینیئر تھے، غالباً بارہ تیرہ برس۔ میر کا خمیر بھی اکبرآباد سے اٹھا تھا، لیکن جلد ہی دہلی چلے گئے۔ کچھ اس طرح کہ دل اور دلّی کے شاعر کہلائے۔ اس کے برعکس نظیر دہلی میں پیدا ہوئے اور کچی عمر میں اپنے ننیہال اکبرآباد آ کر بس گئے۔ روایت ہے کہ میر ایک بار اکبرآباد آئے تو نظیر نے نہ صرف ملاقات کی بلکہ کلام سنانے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس زمانے میں میر کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا، ایسے میں نظیر نے تھوڑا بہت اثر لیا ہو تو کیا بعید۔ نظیر کی چھوٹی بحروں کی غزلیں ملاحظہ کیجئے، ان کے بعض اشعار واقعی میر کے قریب پہنچتے ہیں یا ان میں میر کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ میر کا یہ شعر کس قدر مشہور ہے۔

کہا میں نے گل کا کتنا ثبات
کلی نے سُن کر تبسم کیا

اب نظیر کے دو اشعار دیکھئے۔

دل و جاں ہمارے نہ غنچے سے ملتے
جو اس گل سے ملتے تو ہم گل سے ملتے

ملا تو وہ بولا نظیر اس سے ہنس کر
میاں تم نہ ملتے تو ہم کیوں کر ملتے

میر گل اور غنچہ کے بہترین استاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر میر نے کچھ ایسا لاجواب کہہ دیا کہ یہ غزل اور بعد کی غزلیں تقلید ہی کہلائیں گی لیکن تقلید بھی بری نہیں ہے۔ نظیر نے اپنے ڈھنگ سے دل، غنچہ وغیرہ کا استعمال استادانہ طرز پر کیا ہے۔ اسی غزل کا یہ شعر دیکھئے۔

اگر جا ہمیں اس کے کوچے میں ملتی
تو پھر عمر بھر ہم وہاں سے نہ ہلتے

مانا کہ ہلنے کی ردیف سے شعر بھی تھوڑا ہل گیا ہے لیکن یہ دو شعر اور دیکھئے۔

دکھانے لگی زلف اپنی درازی
مژہ بھی لگی کچھ رسائی جفا نے

جتایا ہے کچھ ناز اس گل نے جس کو
وہی باغِ الفت میں پھولا پھلا ہے

تو جو کل آنے کو کہتا ہے نظیر
تجھ کو معلوم ہے کل کیا ہوگا

اور یہ مزے کا شعر۔

بتوں کے ناز کی جب شوخیاں نظر آئیں
میاں نظیر سے جب ہم فقط نظیر ہوئے

میر کا ایک قطعہ بیحد مشہور ہے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوانِ شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

نظیر کی یہ غزل دیکھئے۔

کل دامنِ صحرا میں ہم گذرے ج وقتِ صبح دم
اک کاسۂ سر پُر الم آیا نظر وہیں
بولا بہ فریاد و فغاں کیا دیکھتا ہے او میاں
تھے ہم بھی سر بر آسماں گو اب تو ہیں زیرِ زمیں
ایک آسماں کے دور سے رک گردشِ فی الفور سے
اب سوچئے گا غور سے در لحظہ آن در لحظہ ایں
سنتے ہی جی تھرّا گیا، رخسار پر اشک آ گیا
دل عبرتوں سے چھا گیا خاطر ہوئی بس سہمگیں
اس میں سر اپنا ناگہاں ہر مو ہوا مثلِ اماں
بولا نظیر آگہہ ہو ہوں من نیز روزے ہمچیں

اور نظیر کی یہ پوری غزل۔

بحرِ ہستی میں صحبتِ احباب
یوں ہے جیسے بروئے آب حباب
گردشِ آسماں میں ہم کیا ہیں
مہر کا ہے میانۂ گرداب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں

وہ بھی ہے اک ہوائے خانہ خراب
عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے
مثلِ تحریرِ موج نقش بر آب
جسم کیا روح کی ہے جولاں گاہ
روح کیا اک سوار پا بہ رکاب
زندگانی و مرگ بھی کیا ہیں
ایک مثلِ خیال و دیگرِ خواب
فرصتِ عمر قطرۂ شبنم

وصلِ محبوب گوہرِ نایاب
سب کتابوں کے کُھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

تو میر کے اثر سے انکار ممکن نہیں بلکہ میں یوں کہوں کہ میر کا یہ جو شعر ہے۔

ہوتا رہتا ہے جہاں میں اک روز شب تماشا
دیکھا میں سیر کو ہے دنیا عجب تماشا

اثر تو چھوڑے مجھے تو نظیر کی پوری شاعری میر کے اس شعر کی تفسیر اور تفصیل نظر آتی ہے۔

میر غیر معمولی شاعر تھے۔ ایک نظیر کیا نسل در نسل ان سے متاثر ہوئی، پورا ایک دبستان قائم ہوا جس کی سربراہی فراق جیسے بیسویں صدی کے شاعر نے کی اور صاف طور پر اعتراف کیا:

''ان غزلوں کے پردے میں تو میر کی غزلیں بولتی ہیں۔''

ممتاز ناقد عزیز احمد نے تو بعض دیگر شعراء میں نظیر کے اثرات تلاش کئے ہیں۔ خیر یہ الگ بحث ہے، اس پر گفتگو پھر کبھی۔

میر کی طرح نظیر کے بھی بعض مصرعے محاورے کے طور پر مشہور ہوئے۔

''ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے''

''مثالِ قطرۂ شبنم رہے رہے نہ رہے''

''تمھارا حُسن تو صاحب اندھیرے کا اُجالا ہے''

''عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان''

''اس نے اس سے اس نے اس سے اس نے اس سے کہہ دیا''

''ایسے طمانچے مارے کہ منھ لال کر دیا''

''صد شکر ہے کہ کاتبِ تقدیر کوئی اور''

سچ تو یہ ہے کہ نظیر اصلاً نظم کے شاعر تھے۔ ان کی شہرتِ عام کی خاص وجہ بھی ان کی رنگ برنگی، البیلی عوامی نظمیہ شاعری ہے۔ انھوں نے اس دور کے مروّجہ شعری روایت سے مجبور ہو کر غزل کی شاعری ضرور کی جو عرصہ تک قارئین کی آنکھوں سے اوجھل رہی۔ خود نظیر بھی اس کی اشاعت سے بے پروا تھے۔ نظم کا کلیات بھی ان کے دو ہندوشا گردان نے شائع کیا ورنہ نہ جانے اس کا بھی کیا حشر ہوتا۔ بہر حال اب ان کی غزلیں دستیاب تو ہیں لیکن ان پر نظموں کے مقابلے گفتگو کم ہوئی ہے۔ یہاں اس مضمون میں بھی چند اشارے ہی کئے گئے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کی غزلوں کا مطالعہ بھی اس نظیر سے الگ نہیں کرتا جو نظم کا شاعر ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں بھی داخلیت کے بجائے خارجیت کو

ہی برتا لیکن خوب برتا۔ نظیر ایسا کرنے پر مجبور تھے، اس لیے کہ جو زندگی وہ جی رہے تھے زندگی کے جس طبقہ اور معاشرہ سے ان کی قربت تھی بلکہ محبت تھی اس طرح کی شاعری کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ صوفیانہ شاعری کو بھی تعمق و تصوف سے نکال کر اسے عمومی رنگ دے دیا۔ یہ کام تو بس نظیر ہی کر سکتے تھے۔ لیکن ہم نے اس بڑے کارنامہ کو بھی حقارت سے دیکھا اور نہ جانے کن کن القاب و آداب سے نظیر کو نوازتے رہے اور دربار سے باہر کرتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نظیر دربار کے شاعر نہ تھے، وہ تو بازار کے شاعر تھے۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں۔

''دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے''

بازار کا استعمال میر نے بھی خوب کیا ہے لیکن جو وسعت و معنویت نظیر نے دی ہے وہ میر بھی نہ دے سکے۔ میر کے یہاں بازار، بازارِ عشق کے معنوں میں زیادہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

''اک عمر سے کساد ہے بازارِ عشق کا''

یا

''محبت کا جب زور بازار ہوگا''

لیکن نظیر کے یہاں بازار بازارِ دنیا ہے۔ اس نکتہ پر بھی گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن یہاں اس کا موقع نہیں۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ پتہ نہیں کیوں اردو شاعری بازار سے، عام انسان سے، معمولی پن سے نظریں چراتی رہی۔ میر کہتے تو رہے کہ ''پر مجھے گفتگو عوام سے ہے'' لیکن بس کہہ کر رہ گئے، لیکن نظیر نے کر کے دکھا دیا۔ دنیا کی بڑی شاعری عمومیت سے خصوصیت تک پہنچتی ہے۔ مقامیت ہی عالمیت اور آفاقیت تک پہنچاتی ہے۔ براہ راست عالمیت و آفاقیت کی باتیں اکثر گمراہ کن ہوتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے جو شاعر جہاں کا ہے اگر وہیں کا نہیں ہے تو پھر کہیں کا نہیں ہے۔ یہ نازک بات اردو کے معیار پرست، مکتبی نوعیت کے نقاد سمجھ ہی نہیں سکتے لیکن فنکار اور تخلیق کار سمجھ سکتا ہے۔ اسی لیے آخر میں شاعر فنکار فراق کی تحریر پیش کرتا ہوں:

''ہم جتنا مہاتماؤں سے سیکھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اپنے جیسے عام لوگوں سے سیکھتے ہیں۔نظیر کا غیر معمولی پن،اس کی صلاحیت کی کسوٹی اور آئینہ ہے۔ یہی انسانی احساس و قربت نظیر کو ہماری اجتماعی زندگی کا زندہ و متحرہ جُز بنا دیتی ہے۔نظیر،شیکسپیئر تو نہیں لیکن اس کی برادری کے شاعر ہیں۔دونوں نے وہی کیا جسے شیکسپیئر کہتا ہے: THE HOLD THE MIRROR UP TO NATURE یعنی فطرت کو آئینہ دکھانا''

(نظیر بانی)

☆☆☆